© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

النبأ العظیم

—: ۱۵ :—

سب سے زیادہ دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ملک میں تعلیم، تربیت اور اخلاق کا معیار روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ اور یونیورسٹیاں جن کو تعمیرِ حیات، تہذیب اخلاق اور اعلیٰ تربیت کا کارخانہ ہونا چاہیے تھا، وہ عملاً نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی تخریب اور ان کی تباہ کاری کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہیں۔ نئی نسل جو آزادی کے بعد کی پیداوار ہے، وہ درحقیقت اس کا اندازہ کر ہی نہیں سکتی، کہ ہم پرانی نسل کے لوگ جنہوں نے انگریزوں کے عہد کے نظامِ تعلیم کو دیکھا اور برتا ہے ان کے قلب و دماغ پر کیا گزرتی ہے، جب وہ آزادی کے بعد کی تعلیمی کیفیت اور حالت کا موازنہ آزادی سے پہلے کی حالت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو اس وقت میں سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں لکچرار اور دہلی یونیورسٹی میں عربی کا ریڈر تھا۔ اسی حیثیت سے دہلی یونیورسٹی کی اکاڈمک کونسل کا ممبر بھی تھا۔ آزادی کے بعد جب ڈاکٹر سید اظہر علی پاکستان چلے گئے تو میں ان کی جگہ دہلی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ عربی و فارسی اور اردو ہو گیا اور کلکتہ جانے تک اسی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ملازمت کے اس تعلق سے پہلے میں سینٹ اسٹیفنس کالج اور دہلی یونیورسٹی کا طالبِ علم بھی رہا ہوں۔ چنانچہ ایم۔ اے میں نے یہیں سے کیا ہے۔ میرے زمانہ میں سر مارس گوائر جو فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے تھے، دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ کوئی وائس چانسلر ہو تو واقعی بنگال کے سر آسوتوش مکرجی کی طرح ہو یا سر مارس گوائر کی طرح! موخرالذکر کو میں نے بہت قریب سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیکھا ہے اور ان کی مجھ پر بہت کچھ عنایتیں رہی ہیں۔ کلکتہ کے لیے روانہ ہوتے وقت انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ دلی یونیورسٹی میں عربی پروفیسر کی کرسی پیدا ہوگی تو مجھ کو دلی واپس آنا ہوگا۔ اور مجھے یاد ہے کہ جب میں نے ہنستے ہوئے ان کے سامنے مرزا غالب کا مصرعہ میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں پڑھا تو وہ بہت محظوظ ہوئے تھے اور تقاضا کر کے شعر کا مصرعِ اول بھی سنا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرایا تھا۔

حق یہ ہے کہ یہ شخص شرافت وانسانیت۔ محبت، خلوص اور ہمدردی کا پیکر تھا۔ ان کو یونیورسٹی کے ساتھ وہی محبت تھی جو ماں کو اولاد کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ کی یورپین زندگی کی راحتوں اور آسائشوں کو قربان کر کے وہ یونیورسٹی کی عمارت کے دو تین کمروں پر قانع ہو کر یہاں آپڑے تھے۔ بیوی بچہ کوئی تھا نہیں، مجرد رہتے تھے۔ اور ان کے وقت کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں تھا جو یونیورسٹی کے کاموں اور اس کے ذکر و فکر سے خالی ہو۔ صبح شام وہ ٹہلنے کے عادی تھے تو ان کی ٹہل یہ تھی کہ ادھر ادھر یونیورسٹی کی جو عظیم الشان عمارتیں بن رہی تھیں اور باغ اور لان تیار ہو رہے تھے سر مارس گوئر صبح شام ان سب کو جا کر دیکھتے اور کام کا معائنہ کرتے تھے۔ ان کی دوربینی اور وقت نظر کا یہ عالم تھا کہ یونیورسٹی لائف کا کوئی معمولی سے معمولی پہلو بھی ایسا نہیں تھا جو ان کی توجہ کی نگاہ سے محروم رہا ہو۔ حد یہ ہے انہوں نے محسوس کیا کہ اساتذہ کی حالت بڑی خراب ہے۔ ان کو تنخواہیں کم ملتی ہیں۔ ملازمت میں ان کو تحفظ (SECURITY) حاصل نہیں ہے۔ کالجوں کی گورننگ باڈیز ان کے ساتھ توہین و تذلیل کا معاملہ کرتی ہیں، اور ان کا معیارِ زندگی اونچا نہیں ہے۔ اس موقع کے لیے موصوف کا ایک خاص فقرہ تھا:

اساتذہ کو سماجی یتیم (SOCIAL ORPHANS) کہتے تھے اور اس بنا پر ان کے حالات کی اصلاح اور ترقی کے لیے جہاں انہوں نے اور بہت سے قواعد و قوانین بنائے، گریڈ بڑھائے اساتذہ کی جماعت میں خود اعتمادی اور پبلک کی نظر میں ان کی عزت و وقعت پیدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کی غرض سے انہوں نے یہ بھی کیا کہ وائسرائے سے مل کر یہ طے کیا کہ سال میں دو مرتبہ ورنہ کم از کم ایک مرتبہ ضرور وائسرائے اور ان کی بیگم کی طرف سے یونیورسٹی اور کالجوں کے تمام اساتذہ کی دعوت ہوگی۔ اس مقصد کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام بھی وائسرائے کی طرف سے ہوگا چنانچہ اس سلسلہ میں کئی مرتبہ راقم الحروف کو بھی وائسرائیکل لاج لارڈ لنلتھگو اور ان کی بیگم کے ساتھ چائے پینے اور ان سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہوچکا ہے۔ بہرحال اس داستان سرائی کا مقصد یہ ہے کہ سر مارس گوئر نے دلی یونیورسٹی کو صحیح معنی میں ملک کی ایک عظیم الشان یونیورسٹی بنانے میں جو اہم رول ادا کیا ہے اس کو تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ ان کی لیاقت و قابلیت، خلوص و ایثار اور بیدار مغزی و روشن ضمیری کے باعث ہر شخص ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اکاڈمک کونسل کی جب میٹنگ ہوتی تھی تو بڑی سنجیدگی اور متانت سے ہوتی تھی۔ کارروائی اس طرح ہوتی تھی کہ کوئی معاملہ زیر بحث آیا تو اس کے متعلق جس کسی کو جو کچھ کہنا ہوا اپنے پانچ منٹ کے مقررہ وقت کے اندر اندر سنجیدگی اور معقولیت کے ساتھ کہدیا۔ جب یہ بحث ختم ہوگئی تو سر مارس گوئر نے بحیثیت صدر اس کے متعلق دو تین منٹ میں اپنی رائے ظاہر کردی اور بس معاملہ ختم ہوگیا۔ میٹنگ میں نہ شور و غل ہوتا تھا اور نہ ہنگامہ۔ نہ چیخ پکار ہوتی تھی اور نہ ہڑبونگ۔

لیکن یہ ڈسپلن اور یہ صورتِ حال صرف ۱۵ اگست ۴۷ء تک قائم رہ سکی۔ آزادی کے بعد اکاڈمک کونسل کی جو پہلی میٹنگ ہوئی ہے (میں اسمیں موجود تھا) تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ اب زمین و آسمان بدل گئے ہیں، اور فضا یکایک متغیر ہوگئی ہے۔ جو لوگ پہلے خاموش رہتے یا تقریر کرتے تو کم کرتے تھے اب انہیں دیکھا کہ منہ پھلا کر اور بازو پھیلا پھیلا کر تقریر کر رہے ہیں۔ سر مارس گوئر ٹوکتے ہیں تو مانتے نہیں۔ قاعدہ کے خلاف بار بار اٹھ رہے ہیں اور بول رہے ہیں۔ سر مارس گوئر کوئی بات کہتے ہیں تو اس کی مخالفت یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ ایک کہتے ہیں تو یہ جواب میں دو کہتے ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہئیے کہ یہ رویہ جو کچھ بھی تھا ان لوگوں کا تھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو میری طرح اس زمانہ کی نئی نسل سے تعلق رکھتے اور جونیئر اساتذہ کہلاتے تھے۔ جو حضرات پرانی نسل کے اور سینیئر اساتذہ تھے وہ اب بھی سر مارس گوئر کی حسب سابق عزت کرتے اور ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ چنانچہ ان حضرات نے جب یہ بدلی ہوئی صورتِ حال دیکھی تو ان کا ماتھا ٹھنکا اور انہیں سخت افسوس اور رنج ہوا۔ میٹنگ کے بعد ان لوگوں نے آپس میں کہا، معلوم ہوتا ہے کہ ملک کو آزاد کرا کے ہم نے انگریز کو کیا نکالا۔ اس کے ساتھ ہی ڈسپلن، نظم و ضبط فرض شناسی، کام کی لگن اور امانت و دیانت یعنی وہ تمام صفات جو ہم نے انگریز سے سیکھی تھیں ان سب کو بھی خیر باد کہہ دیا ہے۔ دلی یونیورسٹی کی یہ صورتِ حال دراصل ایک علامت تھی جس سے قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اب اور دوسری یونیورسٹیوں میں بھی کیا ہوگا۔

سر مارس گوئر نہایت مخلص، بے لوث و بے غرض انسان تھے۔ ہم لوگوں کو اسی وقت یہ خیال ہوا تھا کہ موصوف اب غالباً مزید قیام نہیں کر سکینگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے چند ماہ کے بعد رخصت لی اور وطن چلے گئے اور وہاں سے استعفیٰ بھیج دیا۔ اس زمانہ میں سر راج گوپال اچاریہ گورنر جنرل تھے۔ وہ اور پنڈت نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد تینوں موصوف کے بڑے قدر شناس تھے، انہوں نے اصرار کر کے انہیں واپس بلا لیا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد وہ چند ماہ سے زیادہ نہ رہ سکے اور آخر مستعفی ہو کر پھر واپس چلے گئے۔

اب غور کیجئے! آج ملک میں تعلیم کا کیا حال ہے؟ تقسیم کے وقت یونیورسٹیوں کی تعداد انیس بیس سے زیادہ نہیں تھی، آج ان کی تعداد اسّی سے اوپر پہونچ چکی ہے خاص خاص علوم و فنون پر تحقیقات اور ان کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جو انسٹی ٹیوٹ قائم کئے گئے ہیں وہ بھی پچیس چھبیس سے کم نہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں کا فی صد تناسب بہت بڑھ گیا ہے۔ تعلیم کے لیے حوصلہ افزائی کے جو ذرائع اور وسائل ہوتے ہیں یعنی اسکالرشپ، فیلوشپ، وظائف، انعامات، میڈل وغیرہ ان کی بھرمار ہے۔ اساتذہ کی تنخواہیں، ریسرچ کے لیے سہولتیں، عمارتیں، لائبریریاں، لیبوریٹریز، ہوٹل، کھیل کے میدان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غیر تعلیمی سرگرمیاں، سیمینار، سمپوزیم وغیرہ جیسی چیزوں میں جو وسعت ہوئی ہے اس کا حد وحساب ہی نہیں۔ علاوہ ازیں نصاب تعلیم، طریق تعلیم اور طریق امتحان وغیرہ میں جو اصلاحات ہوئیں اور برابر ہو رہی ہیں وہ ہر شخص کے سامنے ہیں۔ ہر چند برس کے بعد ایک تعلیمی کمیشن مقرر ہوتا ہے اور لاکھوں روپے کے خرچ کے بعد وہ اپنی ضخیم رپورٹ مرتب کر کے پیش کر دیتا ہے۔ آئے دن خاص تعلیم پر سیمینار منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان سب چیزوں کے باوجود کسی بھی صاحب نظر سے پوچھئے کہ اس ظاہری ٹیپ ٹاپ اور طمطراق کے باوجود معنوی اعتبار سے ہم آگے بڑھ رہے ہیں یا پیچھے لوٹ رہے ہیں؟ ہمارے قدم ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہیں یا ہم بڑی سرعت سے نیچے کی طرف جا رہے ہیں؟ ہر سال یونیورسٹیوں میں کنووکیشن ایڈریس پڑھے جاتے ہیں۔ آئے دن ملکی اور غیر ملکی لیڈروں اور ماہرین تعلیم کے بیانات اخباروں میں نکلتے رہتے ہیں۔ ان میں کیا ہوتا ہے؟ موجودہ نظام تعلیم کی از کار رفتگی اور اس کی عدم افادیت کا ماتم ہی یا کچھ اور؟ اور لطف یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس وقت ہے جب کہ امتحانات میں کامیاب ہونے والوں کا تناسب ہر یونیورسٹی میں نشر پچھتر فی صد سے کم نہیں ہوتا۔ اور پھر فرسٹ اور سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہونے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہوتی۔ اب دونوں چیزوں پر ایک ساتھ غور کیجئے تو صاف نظر آتا ہے کہ تعلیم کے بارہ میں ہم سب ایک نہایت عظیم خود فریبی میں مبتلا ہیں گویا:

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

۵۔ یہ تھی تعلیمی حالت! اب اخلاقی حالت پر ایک نگاہ ڈالئے تو حالت اور بھی بدتر نظر آتی ہے۔ آئے دن اسٹرائک۔ عجیب وغریب قسم کے مطالبات اور ان کے لیے ہنگامہ آرائی۔ زد و کوب۔ توڑ پھوڑ۔ وائس چانسلر اور عمائد یونیورسٹی کا گھیراؤ۔ اور خدا جانے اور کیا کیا۔ یہ روزمرہ کے واقعات ہو گئے ہیں۔ جن کے باعث یونیورسٹی، اڈمنسٹریشن روز بروز ناکارہ اور غیر مؤثر ہوتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جا رہا ہے۔ قواعد و ضوابط ہیں، مگر ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اور طلبا جس طرح چاہیں اس کے مطابق ان قواعد و ضوابط میں ترمیم و تنسیخ ضروری ہے۔ ورنہ نہ جانوں کی خیر ہے اور نہ مال کی!

اسٹیٹسمین دہلی مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۷۰ء میں دہلی یونیورسٹی سے متعلق اسٹاف رپورٹر کے قلم سے ایک مضمون شائع ہوا تھا اس کا عنوان تھا "اباحتی کیمپس" (PERMISSIVE CAMPEAS) یہ عنوان خود بتا رہا ہے کہ مضمون میں کیا ہوگا۔ جستہ جستہ اقتباسات آپ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ اس رپورٹ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:-

"دہلی یونیورسٹی کے ہمارے پرانے طلبا اکثر کہتے ہیں کہ طلبا کی نئی نسل وحشی ہوگئی اور سچ مچ تباہ اور خراب و خستہ ہوگئی ہے۔ یونیورسٹی کی زندگی میں اب ایک نئی اباحیت پیدا ہوگئی ہے، اور یونیورسٹی کے ہوسٹل گناہگاری کے اڈے بن گئے ہیں۔ وقت یقیناً بدل گیا ہے۔ وہ زمانہ گیا جب کہ یونیورسٹی میں رومان اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے ہوتا تھا یا لڑکیوں کے ہاسٹل کے آہنی گیٹ کے پاس۔ آج تو عالم یہ ہے کہ سینٹ اسٹیفنس کالج کے ہاسٹل اور ہندو کالج کے ہاسٹل میں لڑکیاں بے تکلف لڑکوں کے پاس آتی جاتی ہیں اور ان کی مجلس میں بے جھجک سگریٹ اور شراب کا دور چلتا ہے۔ اور کوئی اس کا نوٹس بھی نہیں لیتا۔

رپورٹر آگے چل کر لکھتا ہے:

خود ایک لڑکی نے مجھ سے کہا تھا کہ لڑکیوں کے ہوسٹل کا معاملہ بھی یہی ہے۔ وہاں رات گئے تک پارٹیاں ہوتی ہیں اور شراب کا دور چلتا ہے۔ برنڈا ہاؤس کی ایک لڑکی نے بتایا کہ اب ایک لڑکی کو رونقِ محفل بننے کے لیے اچھے اور شائستہ لباس میں ملبوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے وہ عام طور پر ایک سوئیٹر یا قمیص اور پتلون پہنے ہوئے لڑکوں میں گھومتی ہیں۔"

اس قسم کے واقعات کے بعد رپورٹر لکھتا ہے: عجیب بات یہ ہے کہ ہوسٹل کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طلبا اور طالبات کیلئے جو قواعد وضوابط اب سے پندرہ برس پہلے تھے وہ اب بھی ہیں اور ان میں بہت معمولی رد و بدل ہوا ہے۔ اور ان قواعد کی رو سے لڑکیوں کے بیے سگریٹ پینا، مغرب کے بعد ہاسٹل سے نکلنا لڑکوں کے ہاسٹل میں جانا۔ مہینہ میں چند مخصوص راتوں کے علاوہ اور وہ بھی وارڈن کی اجازت سے۔ رات بھر غائب رہنا۔ ناشائستہ اور نامناسب لباس پہننا یہ سب چیزیں اب بھی ممنوع ہیں لیکن کوئی ان کی پرواہ نہیں کرتا۔ اور ہاسٹل کے اربابِ نظم وضبط کی مجال نہیں ہے کہ ان قواعد کو نافذ یا ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دے سکیں۔

رپورٹر نے اس مضمون میں سینٹ اسٹیفنس کالج کا بار بار نام لیا ہے۔ چونکہ طالب علم اور استاد کی حیثیت سے برسوں تک میرا اس کالج سے تعلق رہا ہے اور اس کی شاندار روایات سے میں واقف ہوں اور مجھ کو اس کالج کے ساتھ اب تک تعلق خاطر بھی ہے۔ اس بنا پر رپورٹ میں بار بار اس کالج کا نام دیکھ کر مجھ کو طبعی طور پر بڑا صدمہ اور دکھ ہوا۔ یہ کالج تعلیم اور ڈسپلن دونوں اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ جس زمانہ میں میں یہاں طالب علم تھا اور کالج کشمیری گیٹ کی اپنی پرانی عمارت میں تھا اس کے پرنسپل مسٹر این۔ کے سین تھے۔ موصوف آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ اور بڑی آن بان اور رعب داب کے پرنسپل تھے۔ کالج میں لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں، مگر بہت کم۔ پرنسپل سین نے ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو دیکھا کہ دونوں ہمیشہ ایک ساتھ رہتے ہیں، کلاس روم میں دونوں ساتھ بیٹھتے ہیں۔ کیفے میں ساتھ۔ لان پر ساتھ ایک ساتھ کالج آتے جاتے ہیں۔ چند روز وہ اسی طرح دیکھتے رہے۔ آخر ایک دن لڑکے کو بلا کر کہا کہ تمہارا یہ رویہ سخت نامناسب اور کالج کی روایات کے خلاف ہے۔ میں آئندہ اس طرح نہ دیکھوں! لیکن ان کے رویہ میں تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ اور آخر دونوں کا اخراج کر دیا گیا۔ اور سنیے ایک مرتبہ کالج یونین کے جلسہ میں ایک منکرِ خدا و مذہب لڑکے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے تقریر کرتے ہوئے خدا کی شان میں گستاخانہ الفاظ کہہ دیئے۔ پرنسپل سین کو اطلاع ہوئی تو فوراً لڑکے کو بلا کر کہا: صاحبزادے تم کو معلوم ہے کہ یہ کرسچین کالج ہے اور اس کے قیام کا مقصد ہی خدا کی نام کی عظمت کو قائم کرنا ہے۔ اس لیے کوئی طالب علم یا استاد خواہ کسی عقیدے یا مذہب کا ہو۔ اس کو کالج کے حدود میں خدا کی شان میں گستاخی کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن تم نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس لیے میں حکم دیتا ہوں کہ تم چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تحریری معافی نامہ داخل کرو اور عہد کرو کہ آئندہ ایسا نہیں کروگے۔ ورنہ میں تم کو خارج کر دوں گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے نے معافی نامہ داخل نہیں کیا اور اس کا اخراج کر دیا گیا۔

میں جب کلکتہ گیا ہوں تو اس سے کئی برس پہلے پرنسپل سین کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی جگہ مسٹر راجا رام کالج کے پرنسپل مقرر ہو گئے تھے۔ ان کے عہد میں کالج کی گورننگ باڈی نے یہ فیصلہ کیا کہ کالج میں اب تک لڑکیوں کو بھی داخلہ کی اجازت تھی، لیکن اس کے نتائج اچھے نہیں نکلے ہیں۔ اس لیے اب آئندہ سے کالج میں لڑکیوں کا داخلہ بند کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ کالج میں تھے تو اساتذہ اور طلبا سب ایک خاندان کے افراد کی طرح ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو کر رہتے تھے۔ اساتذہ کا کام صرف کلاس میں لکچر دینا نہیں تھا۔ بلکہ وہ ان کی تربیت بھی کرتے تھے۔ کالج میں صبح کے وقت آتے اور شام کو ہی گھر جاتے تھے۔ کلاس روم کے علاوہ سارا وقت لڑکوں سے بات چیت میں، ان کی تعلیم اور کالج کی دوسری سرگرمیوں سے متعلق ان کی رہنمائی میں صرف کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبا کو اسٹاف پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا۔ اساتذہ طلبا کے گھریلو معاملات میں بھی مفید مشورے دیتے رہتے تھے۔ مجھے کبھی یاد نہیں پڑتا کہ لڑکوں نے کبھی کسی بات پر احتجاج کیا ہو۔ اسٹرائیک کی ہو اور کبھی کسی حکم کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا ہو کس درجہ افسوس اور رنج والم کی بات ہے کہ اب یہی کالج ہے جس کے ہوسٹل میں رہنے والے طلبا انسٹیٹیوشن'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے رپورٹر کے بقول اب اس بات کا مطالبہ اور اس کیلئے احتجاج کر رہی ہیں کہ ان کے ہوسٹل میں لڑکیوں کے آنے جانے پر جو قدغن ہے اسی کو دور کیا جائے۔ اور عملاً غیر قانونی طور پر ایسا ہو بھی رہا ہے جن حساس لوگوں کے دل میں ملک اور قوم اور ان سے بھی بڑھ کر انسانیت کا درد و غم ہے وہ نئی نسل کی اس عام بے راہ روی پر انگشت بدنداں ہیں اور خونِ جگر کے گھونٹ پی پی کر رہ جاتے ہیں لیکن پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اصلاح کی کوئی صورت کہیں نظر نہیں آتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس صورتِ حال کے لیے اپنے نوجوانوں کو ہی ملزم اور ذمہ دار قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ چھوٹے بڑوں سے سبق لیتے ہیں اور غیر شعوری طور پر انہیں کے رنگ میں اپنے کو رنگنا چاہتے ہیں۔ جب ہمارا پورا معاشرہ ہی فاسد ہے اور اوپر سے لیکر نیچے تک، ارکانِ حکومت۔ افسران اپنے اور غیر۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور انتظامیہ۔ والدین اور اعزا و اقارب سب مفاد پرستی اور لذت کوشی کے جنون میں مبتلا ہیں اور علم جیسی مقدس شے جس کا اصل مقصد خدمتِ خلق اور انسانیت کا ارتفاع تھا اس کو بھی حصول و جمع زر اور عشرت اندوزی کا ذریعہ بنا لیا جائے تو پھر اس ماحول اور اس فضا میں نوجوان نسل سے کسی خیر کی توقع کیا ہو سکتی ہے؟

بہر حال یہ ہیں وہ عام حالات جن سے تعلیم کے میدان میں ملک اور قوم دوچار ہے۔ اب اگر مسلمانوں کو اس ملک میں صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک فعال اور موثر گروہ کی حیثیت سے رہنا اور جینا ہے تو ان حالات کو سامنے رکھ کر انہیں لامحالہ غور کرنا چاہیئے کہ ان کا کیا فرض ہے اور انہیں کیا کرنا چاہیئے جس سے وہ خود اپنی اولاد کے لیے بہترین تعلیم اور اعلیٰ تربیت کا انتظام اور ساتھ ہی ملک اور قوم کی اس معاملہ میں مدد کر سکیں۔

© rasailojaraid.com